مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

پندرھویں صدی ہجری

ماضی و حال کے آئینہ میں

— ایک تبصرہ
— ایک جائزہ
— ایک پیغام

اگر اس مختصر مقالہ میں (جو اصلاً ایک تقریر کی شکل میں تھا) کسی صاحبِ نظر کو کوئی خلا یا نقص نظر آئے یا کسی اہم شخصیت یا ادارہ کا نام نہ ملے تو اس کو سمجھنا چاہیے کہ یہ پچھلی صدیوں میں اصلاحی وتجدیدی کوششوں، اور اسلامی جدوجہد کی مفصل روداد، یا اہم دینی و اصلاحی شخصیتوں یا تحریکوں کی ڈائرکٹری نہیں ہے، یہ چند آخری صدیوں کی اصلاحی کوشش کا مختصر تذکرہ اور ایک مختصر جائزہ ہے اور اس کا پیغام ہے کہ ع تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب وہ راقم سطور کیطرف سے محض سال نو کا ایک تحفہ ہی نہیں، نئی صدی کا ایک تحفہ، اور اس کے لئے ایک پیغام ہے، امید ہے کہ ان خامیوں سے چشم پوشی کی جائے گی، جو ایک تقریر اور مضمون میں ہوتی ہیں۔ اور اس مخلصانہ تحفہ کو قبول کیا جائے گا۔

ابوالحسن علی ندوی

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اس وقت دنیا میں پندرھویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے، عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے[1]، اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے۔ لیکن اسلام کی یہ خصوصیت

---

[1] مثلاً عیسوی تقویم (جنتری) جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب ہے، بکرمی جنتری کی جو ہندوستان میں رائج تھی، نسبت بکرماجیت بادشاہ کی طرف ہے، ایران میں اور زردشتیوں کے یہاں یزدگرد ثالث کے دو سنہ مستعمل تھے، ایک اس کی تخت نشینی سے شروع ہوتا تھا۔ دوسرا اسکی موت سے، گریگورین کیلنڈر پوپ گریگوری سیزدہم کی طرف منسوب ہے جو ۱۵۸۲ء سے (باستثنائے روس و یونان) تمام یورپ میں جاری ہے۔

ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے، اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرزِ عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا، یہی خصوصیت اس صدی کی ہے، اس صدی کا آغاز بھی، کسی بڑی شخصیت، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب و محترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے عقیدہ اور نظر میں اللہ کے بعد سب سے محبوب و محترم شخصیت ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے، اور نہ آپ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں، بلکہ آپ کے واقعۂ ہجرت سے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہوگی تو ایک پیغام لے کر آئیگی، وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپؐ نے ایک عظیم مقصد کے لئے اپنے عزیز وطن کو خیرباد کہا، اور ایک نئے شہر میں بود و باش اختیار کی، یہ بات ایک پیغام، اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے۔ آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اسکو ساری دنیا تک پہنچانے کا موقع مہیا کرنے کے لئے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے۔ کہ کسی عظیم مقصد کے لئے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جا سکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جا سکتا ہے، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اسکی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں۔ اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے، اور ارادہ میں عزم و پختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا، اور اسکی قسمت میں کامیابی و کامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اس لئے یہ پندرھویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لئے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لئے وہ کھڑے ہوتے ہیں، ان سب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرھویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہوگی، یا (خدانخواستہ) منحوس و نامبارک؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ:

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ — اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

(سورۃ النجم - ۳۹)

انسان کو اپنی زندگی اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصے میں اسکی سعی آئے گی، اور سعی کے نتائج آئیں گے، اس کے بعد فرماتا ہے:

وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی۔ (سورۃ النجم-۴۰) اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی۔

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں اور تاریخ کے تمام دوروں کے لئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہوگا، اور اس کے اثرات ونتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ یُجْزٰىہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔ (سورۃ النجم-۴۱) پھر اس کو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔

انسانی سعی کی جس نتیجہ خیزی اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے، وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے، اقبال نے انسان کے لئے کہا تھا ؂

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا۔ "خاکی" کی جگہ آپ "صدی" کہہ لیجئے، یہ پندرھویں صدی اور وہ صدیاں جو گذر چکی ہیں، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں، نہ منحوس، اس کے مبارک ومنحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رخ پر ہونے اور صحیح طریقہ پر انجام پانے پر منحصر ہے، ہم کسی صدی کے متعلق بلکہ کسی سال، کسی مہینہ، کسی دن، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہوگی یا منحوس؟ اسلام میں برکت ونحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں، جو بعض جاہلی قوموں میں (جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی تعلیم سے محروم رہی ہیں۔) اب بھی پایا جاتا ہے۔ ہم یہ کہیں کہ آنے والی صدی بہت مبارک ہے۔ اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہوگا، یا یہ صدی کسی ملت یا تقدیر انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہوگی، یہ بالکل اسلامی طرز فکر نہیں ہے، اور کتاب وسنت سے اسکی کوئی تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ تخیل کہ فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس انسانی قوت عمل کو سخت نقصان پہنچانے والا ہے۔ اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعت نحس آنے والی ہے یا فلاں گھڑی منحوس ہے، تو اس قویٰ مضمحل ہو جائیں گے۔ اور اسکی قوت عمل کیا قوت فیصلہ بھی جواب دے جائیگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہم پرستی، بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا، خدا کو اس امت کی تربیت منظور تھی، اس سے کچھ پہلے ہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال ہوا تھا[1]، عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے، اور اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، واقعہ بھی

---

[1] یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ کا ہے، حضرت ابراہیم کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی، جب ان کا انتقال ہوا۔

ایسا غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ کیوں نہ ہو، اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہو اور سورج اس سے متاثر نہ ہو؟ دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علم بردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اسکی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اسکی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آتے ہوں۔) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام، اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بیشک اس کی مثال مل سکتی ہے، لیکن بانیانِ جماعت اور سیاسی رہنماؤں کے یہاں نہیں مل سکتی، آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا، اور فرمایا:

إن الشمس والقمر آيتان من آيات الله لا يخسفان لموت أحد ولا لحياته[1] ...	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی موت یا زندگی پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، اور ان کا قانون دوسرا ہے۔ وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقعہ پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد پیدا ہونے والا نہیں تھا۔ بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی، اور محبت وعظمت پر مبنی تھا، پیدا ہوا تھا۔ اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا۔ اللہ کا رسول اس کو بھی برداشت نہ کر سکا، اور کہا کہ نہیں نہیں! میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں، کائنات اس سے زیادہ وسیع اور اللہ کی ذات اس سے غنی ہے، اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے، یہ ایک اصولی رہنمائی تھی، جو پوری نسلِ انسانی بلکہ ذہنِ انسانی کو دی گئی، ذہنِ انسانی نسلِ انسانی سے بھی زیادہ قیمتی اور قابلِ لحاظ ہے۔ وہ ساری نسلِ انسانی پر حکومت کرتا ہے، نسلِ انسانی ذہنِ انسانی پر حکومت نہیں کرتی، یہ ذہنِ انسانی کا انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے، اور اس کا علاج اور سدِّباب ضروری تھا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جا سکتی ہے نہ منحوس، میں گلاس کی مثال دوں گا۔ گلاس اگر خالی ہے تو آپ اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا برا ہے؟ اس کا انحصار اس "مظروف" پر ہے، جس کا یہ گلاس ظرف ہے، یہ پانی کا گلاس ہے۔ خدانخواستہ اگر شراب ہوتی، تو یہ شراب کا جام ہوتا، اگر اس کے

[1] کتاب الکسوف، صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۶

اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالہ ہوتا، یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم، ایک بالکل غیر جانبدار چیز ہے، آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کو کس چیز سے بھرتے ہیں؟ آپ اس کو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے۔ اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے، اس لئے نسلِ انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی، مبارک ہوگی، یا منحوس ہوگی؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے۔ جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں مَیں تین مثالیں دوں گا، دو مثالیں ان صدیوں کی جن کا آغاز نہایت ہولناک، مایوس کن، ہمت شکن، اور حوصلہ فرسا واقعات سے ہوا، اس وقت کے مؤرخوں اور اہل نظر نے اس صدی کا استقبال ناگواری سے نہیں بلکہ جگر کے زخموں دل کے داغوں اور آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے کیا۔

ابن اثیر، وابن کثیر کی شہادت موجود ہے کہ اسلامی حلقوں نے ساتویں صدی کا استقبال کس طرح کیا۔؟ تمام آثار و قرائن بتاتے تھے کہ یہ صدی مسلمانوں کے حق میں نہیں، ملّتِ اسلامیہ کے حق میں نہیں، اسلام کے حق میں نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے حق میں منحوس ترین صدی ثابت ہوگی، اس کا آغاز ایسے غیر معمولی واقعہ سے ہوا تھا جس طرح کا واقعہ — (مؤرخ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) کے بقول) "اگر کوئی شخص دعوی کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا، تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔"[1]

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے، جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی EMPIRE علاء الدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا، یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا، اور تیرھویں صدی مسیحی چل رہی تھی، تاتاری مور و ملخ کی طرح اٹھے اور عالم اسلام پر چھا گئے۔ ترکستان اور ایران کو زیر و زبر اور پورے پورے شہروں کو انہوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا۔ انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے جن پر چڑھ چڑھ کر انہوں نے صدا لگائی، پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے، اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "سقوط و زوال روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھا ہے کہ:

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کیلئے نہیں نکلے۔"[2]

خیال کیجئے کہ سویڈن کہاں واقع ہے۔؟ انگلستان کا ساحل اس علاقے سے جس پر تاتاریوں کی تاخت ہوئی تھی، جغرافی طور پر کتنی دور تھا، سویڈن کے ماہی گیر جن کا پیشہ ہی ماہی گیری تھا، کچھ عرصہ انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے خوف و دہشت کے مارے نہیں آئے، کیمبرج کی "تاریخ عہد وسطی" کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچے

[1] الکامل لابن اثیر ج ۱۲ ص ۱۴۷ - ص ۱۴۸

[2] گبن ص ۱۶

کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ "آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دیا"[1]

یہ دونوں ان مغربی مصنفین کے بیانات ہیں، جو جذبات اور گردوپیش کے حالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے اور جن پر براہ راست تاتاری حملہ کی زد نہیں پڑی تھی، مسلمانوں نے اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھا، اس کا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جا سکتا ہے، جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زبان زد تھی:

"اذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق" (ہر بات مان لینا لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا) وہ مسلمان قوم جو یاس کے مفہوم سے ناآشنا تھی، جس سے کہا گیا تھا:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر-۵۳) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ مسلمان جنہوں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا:

اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (سورۂ یوسف ۸۷) اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی لوگ ہوتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر ایسی مایوسی طاری تھی کہ ان کے لئے یہ کہاوت بن گئی تھی کہ ہر بات قابل تسلیم ہے۔ قرین قیاس ہے۔ کوئی بات دنیا میں ناممکن نہیں، ناممکن بات صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔

علاء الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے "حصار" سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے اور انہوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان اور ایران و عراق کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اور ان ملکوں کی حکومت اور تہذیب و تمدن کا چراغ گل کر دیا تھا۔ یہی وقت ہے جب زمین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، آرنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں مسلمانوں کی مایوسی اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس وقت ہر حساس آدمی جس کو خدا نے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں دی تھیں اور مقدمات و اسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کے لئے غروب ہو رہا ہے، اس عالم آشوب واقعہ سے مسلمانوں کو اصل نقصان پہنچا تھا، کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اسی لئے سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کام کرنے کا میدان تنگ تھا۔ اور سب سے کم امید ان کے لئے تھی، آرنلڈ لکھتا ہے:

" (اسلام کے علاوہ) دو مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو

---

[1] ماخوذ از "چنگیز خاں" از ہیرلڈ لیمب ص ۲۶۶

اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب وغریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنہوں نے تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔

اسلام کے لئے ایسے وقت میں بودھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچاکر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی"[1]

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اس لئے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں اور ان کے پادری ان کے درباروں میں تھے، اس لئے اگر قبول مذہب کا سوال ہوتا، تو حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ وہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے، لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنے پڑے کہ:

"بالآخر اپنی گذشتہ شان وشوکت کے خاکستر سے اسلام اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنہوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا[2]"

آرنلڈ مزید لکھتا ہے:

"باوجود ان مشکلات کے، مغلوں اور وحشی قوموں نے جو بعد میں آئیں، انہیں مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن کو انہوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا۔[3]"

وہ صدی جس کا آغاز نحوست سے ہوا تھا۔ (اگر نحوست کا کوئی لفظ اسلام کی ڈکشنری میں ہے) وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا، وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بلکہ اسکی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے۔ ہوورتھ لکھتا ہے کہ:

"مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جو پردے پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے۔ یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہنچائے[4]"

---

[1] دعوت اسلام ص۲۴۰ - ص۲۴۱   [2] ایضاً ص۲۴۵ - ص۲۴۶

[3] " " ص۲۴۵ - ص۲۴۶

[4] HOWORTH HISTORY OF THE MONGOLS V.I (LONDON 1876-80) P.159

لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس اسلام نے فاتح تاتاریوں کو فتح کر لیا۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، خدا پر اعتماد نہیں کھویا تھا۔ ایمان وعقیدہ نہیں کھویا تھا، روحانی طاقت نہیں کھوئی تھی، شکست کس نے کھائی تھی؟ شکست کھائی تھی (مجھے بہت تکلیف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔) نالائق مسلمان بادشاہوں نے، ایک کمزور ومریض معاشرہ نے، اسلام اپنی جگہ پر تھا، اسلام کے شیشہ پر کوئی بال بھی نہیں پڑا تھا، مسلمانوں نے اس وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ تاتاریوں کو تلوار سے زیر کرنا ممکن نہیں، اسلام کی تلوار کند ہو چکی ہے، تقریباً ٹوٹ چکی ہے، وہ دولت وحکومت اور تمدن وتہذیب کی خرابیوں اور بیماریوں سے دور ہیں، ان کے اندر مشقتوں اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی وہ طاقت ہے، جو کبھی تازہ دم عربوں اور فاتحین اسلام میں تھی، وہ صدیوں کے بعد صحرا سے نکلے ہیں، ان کی ساری توانائی (ENERGY) ان کے اندر محفوظ ہے۔ ان کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جا سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پھر کس نے تاتاریوں کو فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟ اس نازک گھڑی اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں اہلِ دل سامنے آئے، جن کے اندر روحانی طاقت تھی اور تقریباً نصف صدی کے اندر اندر انہوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنا لیا۔ قبولِ اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، افراد کے قبولِ اسلام کے خاندانوں کے قبولِ اسلام کے شہروں کے قبولِ اسلام کے، لیکن قوموں کے من حیث القوم قبولِ اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں۔ عربوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا، افغانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا۔ (افسوس ہے کہ وہ بھی آج ابتلاء وآزمائش میں ہیں۔) تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں من حیث القوم سو فیصدی اسلام قبول کیا۔ تاریخ کا یہ معمہ ہے۔ اور میں بھی اس آزمائش سے گذر چکا ہوں، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا واقعہ) پیش آئے اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ لیں۔ جن کے سر تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا سہرا ہے، یہ کیا بات ہے؟

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آیا کہ جب مدائن کی فتح میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا، اور وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواج اسلامی سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا۔ جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے" ۔ أیہا الامیر ! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں، تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے۔" پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصع تاج زریں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی۔ اس کو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اس کو اپنے

خیمہ میں سے جاکر رکھ دے، کہا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کیطرف منہ کرکے اور پیٹھ پھیر کر کہا کہ جس کے لئے میں نے یہ کام کیا ہے۔ وہ میرا نام جانتا ہے۔ اور یہ کہہ کر روانہ ہوگیا۔

یہ ایک فرد کا واقعہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تاتاریوں کو کلمہ پڑھانے والوں کا یہی طرزِ عمل تھا، انہوں نے اپنے نام کو چھپایا۔ مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا۔ دو آدمیوں کے نام ملے ہیں، ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام[1] جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیر اعظم تھے، وہ صوفی منش اور عابد و زاہد وزیر تھے، اور ان کا عمل اس پر تھا کہ۔ ع

درویش صفت باش، و کلاہ تتری دار

تاتاری بادشاہ کے کان میں وہ اچھی بات ڈالتے رہے، حتیٰ کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے، اور تاتاری حکمراں سلطان غازان اور اس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لئے ہوتے مسجد کو جا رہے ہیں[2]۔

دوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے جن کے خلوص بے پایاں، سچی روحانیت اور دلی دردمندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ میں جو بلادِ متوسطہ میں (جس کا مرکز کاشغر تھا۔) اسلام پھیلا اور پوری شاخ مسلمان ہوگئی، واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جا رہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے وقعت تھے۔ وہ ان کو طعنہ دیتے تھے اور چڑاتے تھے کہ ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں، اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے، یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا، جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، اور اسکی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا کچھ سال باقی تھے، شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں اور یہ لوگ تو سخت وہم پرست تھے۔ شیخ جمال الدین کو دیکھا کہ وہ شکارگاہ میں داخل ہوگئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا۔ اس نے کہا کہ آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی میں نے صورت دیکھ لی۔ یہ ایرانی کمبخت یہاں آگیا۔ اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ تم اچھے ہو کہ میرا یہ کتا اچھا ہے۔؟ خیال کیجئے اور اس منظر کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا ہے، ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا، کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا! شہزادہ نے کہا کیا مطلب؟ یہ کون سی مشکل بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں، ورنہ یہ کتا اچھا ہے۔

تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی، محض کچھ کہہ دینے سے ایسی ضرب نہیں لگتی، لیکن۔ ع

ہر چہ از دل می خیزد بر دل می ریزد

جو چیز دل سے اٹھتی ہے دل پر گرتی ہے، انہوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہوگا، اس کے ساتھ کتنی دعائیں، کتنے آنسو،

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ [2] البدایہ والنہایہ۔ ج ۱۳ ص ۳۴۰

کتنی آہیں رہی ہوں گی۔ خدایا! کہنے کو تو میں یہ جملہ کہتا ہوں لاشہ تو پیدا کر، یہ وقت ہے، اسلام کی قسمت کے فیصلہ کا! اگر اس شخص کے دل پہ چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ تو ابھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا، جب میں کلمہ پڑھتا ہوا، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اس وقت یقیناً میں اشرف المخلوقات ہوں، میں افضل ہوں، ورنہ یہ کتا ہزار درجہ مجھ سے بہتر رہے گا۔ یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے۔ آرنلڈ کی کتاب PREACHING OF ISLAM میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے [1]

تغلق تیمور نے کہا کہ اچھا اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہد سلطنت ہوں آپ کہیں بھی ہوں، جب یہ سنیں کہ میری تاج پوشی ہو گئی تو مجھ سے ملئے گا، اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعت سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو اور میں خدا کا پیغام اس تک پہنچاؤں، ان کی قسمت میں نہیں تھا، وقت اخیر آگیا۔ مرض موت میں انہوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا، اور کہا کہ بیٹا! ایک بہت بڑی سعادت تھی جو میری قسمت میں معلوم ہوتا ہے نہیں ہے، شاید تمہاری قسمت میں ہو، جس وقت تم یہ سننا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی، اس تک میرا سلام پہنچانا اور کہنا کہ آپ نے میرے والد سے کچھ کہا تھا؛ چنانچہ وہ گئے، کون ان بیچاروں کو محل میں گھسنے دیتا؛ وہ تاتاری شہنشاہ کا محل تھا، دربانوں نے ان کو روک دیا، اس وقت تو انہوں نے انتظار کیا کہ کوئی موقعہ ملے، نہیں موقعہ ملا۔ ایک درخت کے نیچے مصلیٰ ڈال کر وہاں بیٹھ گئے، جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے اور نماز پڑھ لیتے، خدا کو منظور تھا، ایک دن صبح کے وقت جو میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے، انہوں نے اذان دی، وہ آواز محل اور خواب گاہ سلطانی میں پہنچی یا پہنچائی گئی، بادشاہ نے کہا یہ کون باؤلا شخص ہے؟ کیا صدا بے ہنگام لگاتا ہے یہ؟ میں نے تو آج تک یہ آواز نہیں سنی محل کے قریب حفاظت (SECURITY) کے بڑے انتظامات ہوتے ہیں، داروغہ نے کہا کہ حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہوا ہے۔ ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا۔ کہ کوئی مسکین آدمی ہوگا۔ صدا لگاتا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا، اسے پکڑ لاؤ، بلایا گیا۔ بادشاہ نے کہا، تم کون ہو؟ یہ کیا صدا لگاتے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے۔؟

شیخ رشید الدین نے کہا کہ سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ شکار کھیلنے کے لئے نکلے تھے۔ ایک مسلمان فقیر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ تم اچھے ہو یا میرا کتا اچھا ہے۔؟ انہوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہو گیا۔ الحمدللہ وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

بادشاہ نے سنا اور وزیر اعظم کو بلایا، کہا کہ ایک راز ہے۔ جو میرے سینہ میں تھا۔ یہ واقعہ میرے ساتھ گذرا

---

[1] آرنلڈ کی کتاب میں اس واقعہ پر شیخ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ "کہ اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا۔ تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔"

ہے ، اس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا ، تمہاری کیا رائے ہے ؟ وزیر نے کہا کہ حضور والا ! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں ، میں تو اپنے اسلام کو چھپا رہا تھا ، میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا ، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا ۔ اور وزراء بلائے گئے تھے اور جب بادشاہ کا منشا معلوم ہوا تو سب مسلمان ہو گئے ۔

ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ تہذیب تھی ، نہ علم و ادب ، نہ کوئی آسمانی مذہب جس کو عقل قبول کرے ، قانون بھی انہوں نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا ۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (سورۂ فتح ۔ ۷) اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کے لشکر ہیں ۔

یہ خدائی تدبیر تھی ، اتنے متمدن اور ترقی یافتہ مملکت کا نظم و نسق کرنا تاتاریوں کے بس کا روگ نہ تھا ، وہاں مسلمان قانون ساز موجود تھے ، آب پاشی کا نظام ، تحصیل وصول کا نظام ، مقدمات کے فیصلے ان کے پاس ایک مختصر و محدود قانون تعزیرات تھا جو صحرا کی محدود زندگی اور اس کے تجربات پر مبنی تھا ، پہلے سے وہ مسلمانوں کے دست نگر تھے ۔ مسلمان دانشور ، ماہرین قانون اور علماء پہلے ہی اپنا کام کر چکے تھے اور انہوں نے اتنی بڑی مملکت کے نظم و نسق میں ان کی مدد کی تھی ، اور اسلام کی زندگی کی رہنمائی اور معاشرہ و مملکت کی تنظیم کی صلاحیت کا نقش ان کے دماغوں پر قائم کر دیا تھا ، انہوں نے دیکھا کہ اب صرف عقیدہ اور ایمان کی بات باقی تھی ، وہ مرحلہ یہاں طے ہو گیا ۔

اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا اور پورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہو گئے ، ادھر امیر توزون کی کوشش سے عراق میں جو خاندان حکومت کر رہا تھا ، اسلام قبول کر چکا تھا جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں ، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے ، یہ مسلمان دانشور ، مخلص علماء ، واعظین ، مبلغین اور سب سے بڑھ کر اہل دل کا کارنامہ تھا ، اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ۔ پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہل دل نے اندر اندر کام کیا ہے ، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں ، یہ لاکھوں انسان (جنہوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انہیں کے حساب میں شمار ہوں گے ، ان اہل دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آ رہا ہے ۔

اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیر گل
افسوس ہے انہیں کے ہزاروں گلے ہوئے

میں نے ایک ایسی صدی کی مثال دی جس کا آغاز نہایت ہولناک حالات اور اسلام کے حق میں پیام موت سے ہوا تھا ، لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری ، انہوں نے سلطنت ہاری تھی ، ہمت نہیں ہاری تھی ، اور مسئلہ یہی ہے کہ

سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے گیارہویں مرتبہ آسکتی ہے، ہمت ایک مرتبہ ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی، داعیانِ اسلام بغیر کسی پروپیگنڈے کے خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے اس وقت کوئی انجمن بنائی ہو کہ تاتاریوں کو مسلمان کرنا ہے، پہلے انہوں نے یہ اشتہار دیا ہو کہ تاتاری مسلمان ہوں گے تو یہ فائدہ ہوگا۔ اس سے کھوئی ہوئی سلطنت ملے گی، اقتدار قائم ہوگا کچھ نہیں، خود مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اچانک یہ معلوم ہوا کہ پوری کی پوری قوم اسلام کی جھولی میں ڈال دی گئی۔

میں نے ایک مثال ساتویں صدی ہجری، اور تیرھویں صدی عیسوی کی دی، جس کا آغاز ایسے مہیب اور ایسے ہولناک حالات سے ہوا تھا جس سے مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے۔ اور خدانخواستہ اگر ان میں عقیدہ کی طاقت نہ ہوتی، تو اگر ایمانی ارتداد نہیں تو تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو ضرور آجاتا، اس وقت نہ تہذیبی ارتداد آیا نہ ذہنی ارتداد، اور ایمانی ارتداد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دوسری مثال میں دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کی دوں گا، میں اس موقعہ پر عالم اسلام کی وسعتوں میں نہیں جاؤں گا، ہندوستان کا تذکرہ کرتا ہوں، دسویں صدی ہجری کا وسط اس حالت میں آیا کہ ہندوستان اسلام کی قیادت و رہنمائی بلکہ اسلام کے برکات ہی سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوگیا تھا، بظاہر نظر آرہا تھا کہ چند دنوں کا معاملہ ہے، تفصیلات آپ بڑی کتابوں میں پڑھیے[1] اس وقت عالم اسلام میں دو سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، ایک عثمانیوں کی سلطنت ایشیائے کوچک اور مشرق وسطیٰ میں، دوسری مغلوں کی سلطنت اس تختی براعظم میں، اس کے بعد اگر نمبر تھا تو ایران کی صفوی سلطنت کا، یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ایک قوی الارادہ، صاحب عزم، ذہین، فاتح اور کشور کشا سلطانِ وقت کے ساتھ اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابوالفضل اور فیضی کا نام سب سے نمایاں ہے۔) ایک تحریک میں شامل ہوگئے، جس کا مقصد ہندوستان کا رُخ اسلام سے ہٹاکر اکبر کے دین الٰہی اور اس وحدت ادیان کیطرف موڑنا تھا، جس میں پلڑا ہمیشہ دوسری طرف جھکا ہوا ہوتا تھا۔[2]

یہ مادی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلق العنان سلطنت اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی، جس کی مثالیں تاریخ میں کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا کہ دسویں

---

[1] مثلاً تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم

[2] اس رواداری اور صلح کل تحریک میں اسلام کے ساتھ مساویانہ و منصفانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا۔ قدرۃً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جھک گیا، جس کا دربار میں رسوخ اور بادشاہ کی طبیعت میں رجحان غالب تھا، "مختصر تاریخ ہند" کے مصنفین ڈبلیو۔ ایچ مورلینڈ اور اے۔ سی چٹرجی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے۔" (صد ۲۵۱)

صدی ختم ہو رہی ہے۔ گیارہویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کے لئے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے۔ ایران و ہندوستان کے بہت سے فاضلوں نے جن کو خوف خدا اور دین کا گہرا علم نہیں تھا، اور جاہ و اقتدار اور منصب و عہدہ کی ہوس تھی، اس کے لئے مواد فراہم کر دیا کہ فلاں مذہب کا ستارۂ اقبال اتنے دنوں تک بلند رہا۔ ایک ہزار سال کے بعد دوسرا مذہب آیا، اور دوسری فکری رہنمائی اور قیادت میدان میں آئی، اب دینِ عربی کی عمر پوری ہوگئی ہے اور رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایک ہزار سال گذر گئے ہیں، اس نسل کو نئے دین و آئین کی ضرورت ہے۔ اکثر ایسے فتنے ان فلسفوں سے پیدا ہوتے ہیں جو مذہب اور اخلاقیات کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس خطرہ کا ذرا اندازہ کیجئے، اس تحریک کا علم بردار اور رمز (SYMBOL) وہ شخص تھا جس کی تلوار کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی، جس نے ہر ناقابلِ تسخیر مہم کو سر کیا تھا، اور جو شکست و ناکامی کو جانتا نہیں تھا جس میں جوانی کا خون تھا، اور اپنے جدِ اعلیٰ تیمور کی حوصلہ مندی اور بابر کی مشکل پسندی، ایک طرف وہ شہنشاہ ہے، اور دوسری طرف وہ ذہین ترین انسان ہیں جن کی آج بھی آپ تحریریں پڑھیں تو ان کی ذہانت کا لوہا مان جائیں گے۔

پھر کیا ہوا؟ دسویں صدی کا آخر یہ خبر دے رہا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری طاقتوں اور فلسفوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پر پانی پھیر رہا تھا، جنہوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا، اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنہوں نے اپنے اپنے گوشے میں بیٹھ کر سعید روحوں کو انسانیت اور محبت، مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا درس دیا تھا، باہر رہ کر حکومتِ وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی اور امانت دار، خدا ترس، انسانیت دوست افراد مہیا کئے تھے، اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی روح پھونک دی تھی۔[1]

پھر کیا ہوا؟ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی افق سے نہیں، کسی مادی افق سے نہیں، صرف اسی ایمان و روحانیت کے گوشہ سے، اسی اخلاص و للہیت کے گوشہ سے، اسی علم و حکمت کے گوشہ سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے، اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے جس کا نام شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ (۹۷۱ھ — ۱۰۳۴ھ) ہے جس کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے جس میں اس وقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزت و آزاد طریقہ پر رہنے اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کئے جاتے ہیں، اور صرف انہیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔؟

پھر کیا نتیجہ ہوا۔؟ گیارھویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے۔ اس کے بعد سے دو تین صدیوں تک کے لئے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کر دیا گیا۔ اس وقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت و رسالت محمدی کی ضرورت و بقا اور شریعت و سنت کے مقام و دوام کے خلاف جو علمی و اشراقی مغالطے تھے ان کا پردہ چاک کیا اور اس پر اعتماد بحال کیا۔[1] دوسری طرف اس خطرہ کا سدباب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا، اسکی (STRATEGY) حکمت عملی کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو منظم کرنے کی کوشش نہیں۔ اس کے تاریخی مطالعہ نے بھی اور اسکی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دئے جاؤ گے، تمہیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا۔ اللہ سے دعائیں کرو، اپنے گرد مخلص اور لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو، وہ دولت اور حکومت کے دریا سے گذر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وہ جاہ و حشمت کیطرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربار جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز ہیں، ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ "ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اس وقت موت و زندگی کے آخری مرحلہ سے گذر رہا ہے، آپ کو کچھ کرنا چاہیئے، جارحانہ طریقہ سے نہیں بالکل تعمیری علمی اور فکری طور پر اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ۔"

مجدد صاحب نے خط و کتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے جن سے انہوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں، اور نواب مرتضیٰ خاں، (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ ۱۵۔۲۰ برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا، ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے مرجع و مرکز بن گئے، روحانیت میں، علم حدیث اور عربی لغت تک میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی۔) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر و محقق پیدا ہوتے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (۱۱۱۴ - ۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سامنے آئی، جنہوں نے ایک نیا "علم کلام" پیدا کیا، نظام خلافت کی ایسی تشریح و تفصیل اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم"۔ باب پنجم

(جس کا بدل اس وقت موجود نہیں تھا۔) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہنچانے کی کوشش کی کہ اسکی شکست و ریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی و اخلاقی انتشار کا خطرہ تھا[1]

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز پیش پیش تھے۔) اس ملک میں کتاب و سنت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقائد اعمال و رسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔

اسی سلسلۂ طلائی کی ایک زریں اور مستحکم کڑی اصلاح و جہاد احیائے سنت و احیائے خلافت کی وہ عظیم الشان تحریک تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) کی قیادت میں اس برعظیم میں شروع ہوئی، اور جس نے انقلاب حال، اسلامی سیرت، دینی حمیت اور آدم گری اور مردم سازی کے وہ نمونے پیش کئے جنہوں قرون اولیٰ کی یاد تازہ کر دی۔ اس جماعت نے دعوت و اصلاح کے اتنے وسیع اور طویل محاذ پر اپنی جد و جہد جاری رکھی جسکی نظیر عالم اسلام کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے[2]

پھر عظیم دینی مدارس کا دور آیا اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور وہ دوسرے مدارس جابجا قائم ہوئے جن کی بنیاد خالص کتاب و سنت کی تعلیم و اشاعت پر تھی[3] ان مدارس کے عالی مرتبہ بانیوں اور مخلص و راسخ العلم فضلاء کی مساعی جمیلہ سے بڑے پیمانہ پر عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی۔ دینی ذوق اور اسلامی حمیت پیدا ہوئی، ان میں سے ایک بڑی تعداد نے آزادی کی تحریک اور ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، اور ان کی وجہ سے (بعض دوسرے اسلامی ملکوں کیطرح) مذہب و سیاست کی تفریق کا اصول کامیاب نہیں ہونے پایا اور ملک کے عوام اور تعلیم یافتہ طبقہ علماء و اہل دین کی قیادت سے (باغی ہونے کا کیا ذکر) ان کی رہنمائی و اثرات سے بھی آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکے۔

ان علماء کی علمی کاوشوں کی بدولت ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی کہ اگر یمن میں مراکش میں، کسی شخص کو علم حدیث میں کمال پیدا کرنا مقصود ہوتا تو سیدھا ہندوستان آتا، اسی طرح اگر کسی کو روحانی پیاس بجھانے کا شوق ہوتا، اور وہ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتا تو ہندوستان کا رخ کرتا، مولانا خالد رومی پیدا ہوتے ہیں۔ عراق اور شام کے شمالی حصہ میں جو ترکی میں داخل ہے، ساری تعلیم و تربیت ان کی شہر زور اور دمشق کی ہے۔ لیکن جب ان کو اپنی روح کی پیاس بجھانے اور اللہ کی باتوں پر، غیبی حقائق پر، وہ یقین پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا، جو بدیہیات اور ریاضی کے نتائج پر ہوتا ہے، تو وہ کہاں گئے؟ وہ اپنے وطن شہر زور سے سیدھے دہلی شاہ غلام علی صاحب (م ۱۲۴۰ھ) کی خانقاہ میں

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ [2] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" از ابوالحسن علی ندوی۔

[3] ان کے تفصیلی تعارف کے لئے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ" ملاحظہ ہو۔

آئے اور وہاں آکر بس گئے، اور یہاں سے کامیاب ہوکر گئے، اور عراق اور شام اور ترکی کے ملکوں میں انہوں نے اخلاق و روحانیت اور معارف و حقائق کے دریا بہا دیئے، اور ایک نئی روح پھونک دی، جس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

اگرچہ یہ گفتگو ہندوستان کی اصلاحی و تجدیدی تحریکوں تک محدود تھی، لیکن اس میں بیرون ہند، بلکہ مرکز اسلام — (جزیرۃ العرب) کی عظیم تحریک تطہیر عقائد اور دعوت دین خالص کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ — ۱۲۰۶ھ) کی دعوت تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر ہیں[1] اس تحریک نے بعض خاص تاریخی و سیاسی اسباب کی بنا پر وہ کامیابی حاصل کی، جو کم مصلحین اور داعیوں کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں ایک پوری نسل، ایک وسیع سلطنت، اور ایک مکتب فکر پیدا ہوا، جس کے اثرات دور دور پھیلے، اسی زمانہ میں یمن میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (۱۱۷۲ — ۱۲۵۰ھ) عسیر میں احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی بانی سلسلۂ ادریسیہ اور لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۲۰۶ - ۱۲۷۶ھ) پیدا ہوئے[2] جنہوں نے اپنے اپنے مقامات پر اصلاح عقائد و رسوم، اشاعت کتاب و سنت اور مجاہدانہ تربیت و سیرت سازی کا عظیم کام انجام دیا، مغربی مستشرقین ان سب مصلحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت و تحریک کا خوشہ چین اور ان کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا ثبوت مشکل ہے، مغربی ذہن اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ قرآن و حدیث کا مخلصانہ مطالعہ ہر دور میں ایسی اصلاحی شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے، جو بگڑے ہوئے حالات اور فاسد خیالات سے نبرد آزما ہیں، اور اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، اسی کے کچھ بعد علامہ سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۱۴ - ۱۸۹۷ء) نے اسلامی حمیت اور اتحاد عالم اسلامی کا صور پھونکا، جس سے مصر و شام اور ترکی کے دشت و جبل اور بام و در گونج اٹھے، انہوں نے اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مصری (م ۱۳۲۳ھ - ۱۹۰۵ء) نے اپنے عہد کی ذہین اور بے چین نوجوان مسلمان نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا[3]

---

[1] شیخ محمد بن عبدالوہاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً ہم عمر ہیں۔ شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے۔ اور شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ کی، شیخ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

[2] مشہور مجاہد و مصلح سیدی احمد الشریف السنوسی (امام السنوسی) انہی محمد بن علی السنوسی کے پوتے تھے، جنہوں نے طرابلس اور برقہ کی جنگ میں اٹالیوں کے چھکے چھڑا دئے، اور تیرہ برس تک محض اپنے تربیت یافتہ رفقاء اور تلامذہ کی مدد سے یورپ کی اس بڑی طاقت کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے۔ وہ سیف و تسبیح اور قرآن و شمشیر کے بیک وقت حامل تھے۔ اور ان کا شمار اپنے وقت کے شیوخ کبار، اور اہل اللہ میں سے تھا، ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۳ء) میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی" از امیر شکیب ارسلان ج ۲

[3] پچھلے چند برسوں سے دونوں (استاد و شاگرد) کی شخصیتیں تنقید و تحقیق کا موضوع بن گئی ہیں اور ان کے خلاف عربی رسائل اور علمی مجالس میں مضامین اور خطابات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن کی وجہ سے ان دونوں کی شخصیتوں کی عظمت اتنی مسلّم نہیں رہی جتنی ربع صدی پہلے تھی، لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے نوجوانوں کا اسلام کی صلاحیت اور عقلیت پر اعتماد بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"۔

جہاں تک چودھویں صدی ہجری کا تعلق ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ کامیابیوں اور ناکامیوں، غلطیوں اور تلافی کی کوششوں، مسلمان قوموں کی فریب خوردگی اور سادہ لوحی اور اسی کے ساتھ سیاسی شعور اور بیداری، کثیر التعداد آزاد مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے قیام اور اسی کے ساتھ متعدد طاقت ور اسلامی تحریکوں کی صدی ہے۔ اس صدی میں واقعات وحوادث کا جو تنوع اور تضاد نظر آتا ہے اسکی مثال پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت اور کروفر کے ساتھ موجود تھی اور مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید خاں ثانی (۱۲۹۱ - ۱۳۲۷ھ / ۱۸۷۶ - ۱۹۰۹ء) متمکن تھے جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنی رہی ہے، اور مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مؤقر عربی و ترکی رسائل میں شائع ہوئے ہیں، نیز ان کے روزنامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود جو موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں، اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردعمل بھی) ایک نہایت باحمیت اور صاحب غیرت مسلمان حکمران تھے، جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے اور یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور جنہوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیشکشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ اور زمین سے مٹی کی مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ "بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لئے تیار نہیں[1]" اور جنہوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں ایک نئی روح اور عالم اسلام میں وحدت اسلامی اور "جامعہ اسلامیہ" کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

دولت عثمانیہ جو تولیت حرمین شریفین کے شرف اور خلافت اسلامیہ کے اعزاز سے مفتخر تھی، اپنی ساری کمزوریوں اور داخلی وخارجی فتنوں اور مہیب سازشوں کے باوجود ملت اسلامیہ کے لئے خواہ کہیں بستی ہو، قوت و عزت کا سرچشمہ اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے ایک آہنی حصار تھی، جس کی موجودگی میں یہ مقامات و ممالک (جن سے مسلمانوں کی عزت وقسمت وابستہ تھی اور ہے) لاوارث آدمی کے مال کیطرح تقسیم نہیں کئے جا سکتے تھے، اس صدی کی ابتدا میں دولت عثمانیہ مشرق میں یمن وعسیر سے لے کر مغرب میں ایک طرف یورپ میں ادرنہ والبانیہ، افریقہ میں طرابلس، تونس فزان تک، دوسری طرف جنوب میں اسوان، مصر، برقہ سے لے کر شمال میں بلگیریا ریاست ہائے بلقان طرابزون اور ایڈریانوپل تک وسیع تھی، دولت عثمانیہ کے حدود میں ایشیائے کوچک کا اکثر حصہ شام (جس میں موجودہ

[1] یہ روایت میں نے مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کی زبان سے کئی بار سنی جو اس سلسلہ کے ایک معتبر راوی اور ثقہ گواہ تھے۔

فلسطین، لبنان اور شرق اردن بھی شامل تھے۔) مصر، جزیرۃ العرب، عراق، جزیرۂ قبرص شامل تھا۔ اور یورپ پر بھی اس "مردِ بیمار" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن مسلمانوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی (جو خلافت اور ایک وسیع مسلم امپائر کی شکل میں ان کو خدا نے دی تھی۔) سلطان عبدالحمید خاں کی ۱۹۰۹ء میں معزولی تو ایسا المناک واقعہ نہ تھا جس سے تاریخ بدل جاتے وہ اس وقت کے سیاسی حالات یا سلطان کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ان کے بعد علی الترتیب سلطان رشاد سلطان وحید الدین خاں اور سلطان عبدالمجید تخت سلطنت اور خلافت پر متمکن ہوئے۔ لیکن اصل المناک واقعہ جس سے پورے عالم اسلام کو ذلت و نکبت کا سامنا کرنا پڑا اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہاتھ دھونا پڑا اور بقول مولانا شبلی کے "حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی نگاہیں اٹھیں" ممالک عربیہ مصر و شام (عظیم) عراق اور افریقہ پوری شمالی پٹی براہ راست یا بالواسطہ مغربی اقوام و ممالک کے زیر حکومت یا زیر انتداب آئے اور جس کی سزا کی میعاد (جہاں تک مغربی ایشیاء کے عرب ممالک کا تعلق ہے۔) ابھی ختم نہیں ہوئی، ترکوں کے خلاف وہ اقدام تھا جو عربوں نے اپنے ممالک کی چالاک عیسائی اقلیت کی سازش کا شکار اور اتحادیوں کے پُرفریب وعدوں پر اعتبار اور قومیت عربیہ کے سحر سامری سے مسحور ہو کر پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر کیا، اور جس کے قائد شریف مکہ شریف حسین تھے جنہوں نے ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے نتیجہ میں ۱۹۱۸ء میں شام و فلسطین ترکوں سے آزاد ہوئے مصر برطانوی اقتدار میں چلا گیا، ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شریف حسین کے فرزند امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے، فرنچ جنرل گورو نے فاتح بیت المقدس اور آبروئے اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ "لو صلاح الدین ہم یہاں تک آگئے اور ہم نے شام فتح کر لیا، تم کب تک سوتے رہو گے" اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق و عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آچکے تھے

سارا عالم اسلام اس صورت حال سے بے چین تھا، اور مسلمان ذلیل، لیکن سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس پر بے چینی محسوس کی، اور اپنے قلبی و ذہنی اضطراب کا مظاہرہ کیا، یہی زمانہ ہے، جب تحریک خلافت نے (جو اس صدی کی سب سے بڑی نیم دینی نیم سیاسی تحریک تھی) مسلمان علماء و قائدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ کی قیادت میں (جو اپنی طاقتور شخصیت، اسلامی حمیت اور پرجوش خطابت میں عالم اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے) سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس موقعہ پر مسلمانوں کا دل ناسور کیطرح بہا، اور ملی احساس کوہِ آتش فشاں کیطرح پھٹا، اس زلزلہ انگیز تحریک سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ پورے ملک میں سیاسی شعور اور مغربی اقتدار اور تہذیب سے نفرت کا

جذبہ پیدا ہوا، خود گاندھی جی جیسے عظیم ملکی قائد نے اس تحریک کا ساتھ دیا، اور اس کے قائدین کے ساتھ ملک گیر دورے کئے۔

لیکن جب ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفیٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا، تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آنے لگی، اقبال نے اسی موقع پر کہا تھا ؎

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالم اسلام کے لئے روح فرسا اور ہوش ربا تھا، اور ایک طرح سے اس کو ساتویں صدی ہجری کے اس نصف اول سے مماثلت تھی جس میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام کے زرخیز و مردم خیز متمدن اور مرکزی ممالک پر حملہ اور پھر قبضہ کرکے اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا، لیکن وہ محض ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کی متمدن و تن آسان اسلامی دنیا تاب نہ لا سکی، اس کے ساتھ کوئی فکری فلسفہ کوئی تازہ دم تہذیب اور نئے افکار و اقدار نہ تھے۔ لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس تاخت کی جو چودھویں صدی کے پہلے ثلث اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جدا تھی، اس کے ساتھ نئے فلسفے نیا نظام تعلیم نئے افکار و اقدار، الحاد و تشکیک کا نیا لشکر اور مادیت و مادہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب پیش آیا، جو صرف تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی نقشہ کو ہی تبدیل کرنے والا نہ تھا، اور وہ اقتصادیات و سیاسیات ہی کے حدود میں محدود نہ تھا، عقیدہ و عمل اصول و مبادی، اخلاق و معاشرت بلکہ حیات انسانی اور شعور انسانی کی بنیادوں کو منہدم کرنے والا اور ان کے ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والا تھا، اس کی زد سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں پر پڑنے والی تھی جو ایک مثبت، متعین اور مختتم دین کے پیرو اور داعی تھے۔ اور جن کے دین کی حقیقت اور فرائض میں "احتساب کائنات" کا فریضہ بھی شامل تھا، مگر افسوس ہے کہ ان میں بر وقت اس خطرہ کو محسوس کرنے والے اور اس کا مقابلہ کرنے والے بہت کم تھے، اور انہوں نے اس معاملہ میں اس "فراست مؤمن" کا ثبوت نہیں دیا جو اس سے پہلے اس سے کم درجہ کے خطرات کو بھانپ لیتی تھی، مغربی عالم اسلام میں ترکی کے سابق وزیر حربیہ اور مومن مجاہد غازی انور پاشا مرحوم نے بالشویکی خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کیا، انہوں نے ترکستان کے باشندوں کو منظم کرکے کمیونسٹوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا، ۱۹۲۱ء ۔ ۱۹۲۲ء میں ان کے اور بالشویکوں کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں۔ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے قریب انہوں نے ایک روسی فوج پر حملہ کیا، غنیم کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس جنگ میں انور پاشا شہید ہوئے یہ جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کی غالباً ساتویں تاریخ۔

اسی انقلاب سے نہ صرف یہ کہ وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی کے مردم خیز و تاریخ ساز ممالک، روسی و چینی ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور وہاں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کو نہ صرف ذہنی و تہذیبی ارتداد بلکہ اعتقادی و ایمانی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دیا۔ اور وہاں اسپین کی وہ تاریخ دہرائی جانے لگی جو نویں صدی ہجری میں پیش آئی تھی، بلکہ صرف اس تحتی براعظم کو نہیں ممالک عربیہ و مرکز اسلام کو بھی اس تحریک سے متاثر ہونے کے خطرے سے دوچار اور اس کا حلیف یا حریف بننے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا، اور نوبت یہاں تک آئی کہ بعض عرب ممالک نے اس سے صرف اسلحہ، جدید مصنوعات ہی درآمد نہیں کیں، اس کی آئیڈیالوجی اور اس کا فلسفہ بھی درآمد کیا۔ اور اس کے پُرجوش حامی اور داعی بن گئے اور اب ماضی قریب میں اس افغانستان پر بھی اس کا فوجی تسلط ہو گیا، جو اسلامی شجاعت اور حمیت کا معدن و مخزن تھا اور جس نے ہندوستان کو ہر دور میں لائق منتظم حاکم و قائد اور عالم و درویش مہیا کئے تھے، اور جو اسکی آزادی کا پاسبان اور اس کا بیرونی قلعہ تھا، اور اس طرح یہ فتنۂ عالم آشوب برصغیر کے دروازہ پر پہنچ گیا۔

افغانستان پر روسی جارحیت اور مؤتمر المصنفین کی اہم پیشکش

روسی الحاد

پس منظر و پیش منظر

تالیف و اشاعت ——— مؤتمر المصنفین

سوشلزم اور کمیونزم حریت اقوام، آزادی افکار کا غاصب اور دیگر مذاہب کا عظیم دشمن اور انسانی اخلاقی قدروں کا کن کن طریقوں سے باغی ہے؟ ان سب باتوں کا جواب اور کمیونزم کی فکری نشوونما، جنگ اقتدار، مظالم اور چیرہ دستیوں، مستقبل کے ناپاک عزائم کا تحقیقی اور تفصیلی جائزہ۔

اہم ابواب کی ایک جھلک جبکہ ہر باب کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے

۱۔ محرکات و عوامل
۲۔ سوشلزم کا فکری سفر
۳۔ عملی سرگرمیاں اور جنگ اقتدار
۴۔ سوشلزم کی چیرہ دستیاں
۵۔ مذہب و اخلاق دشمنی
۶۔ سامراجی تسلط۔ روس اور افغانستان، پاکستان اور سوشلزم

افغانستان پر ظالمانہ یلغار کے بعد روس پاکستان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ آیئے عملی جہاد کے ساتھ ساتھ علمی و فکری جہاد کیلئے بھی کمربستہ ہو جائیں ——— ایک بھیانک اور مکروہ چہرہ جسکو بے نقاب کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے

بلاشبہ اس موضوع پر ایک مستند اور تحقیقی کتاب

جس کیلئے صدہا ماخذ کو کھنگالا گیا ہے

قیمت ۱۴ روپے صفحات ۲۷۰ کاغذ و طباعت عمدہ۔ تبلیغ کے لئے سو نسخوں پر ۳۳ فیصد رعایت

آج ہی طلب فرمائیں

مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور، پاکستان

مؤتمر المصنفین کی ایک تازہ تاریخی پیشکش

قادیان سے اسرائیل تک

تالیف و اشاعت ——— مؤتمر المصنفین

قادیانیت مذہبی سے زیادہ ایک اسلام دشمن سامراجی سیاسی تنظیم ہے، برطانوی سامراج اور یہودی صیہونیت نے اس سیاسی تحریک کو عالم اسلام کے خلاف کیسے کیسے استعمال کیا؟ اسرائیل کے قیام میں اس کا کردار کیا تھا؟ ایسے تمام مخفی گوشوں کا پہلی بار جامع مستند اور مدلل انداز میں تحقیقی جائزہ

کتاب کے تیرہ ابواب کی ایک جھلک ہر باب کئی ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے

۱۔ سیاسی تحریک مذہبی بہروپ
۔ یہودی مسیح موعود
۔ سامراجی صیہونی آلۂ کار
۔ حکیم نورالدین کا دور
۵۔ سیاسیات دور ثانی
۶۔ مرزا محمود کی لندن یاترا
۷۔ لندن منصوبے کی تکمیل
۸۔ نئے مبلغ نئے فتنے
۹۔ عالمی استعمار کے گماشتے
۱۰۔ جنگ عظیم اور قادیانی تحریک کار
۱۱۔ تحریک پاکستان اور قادیان
۱۲۔ اقوام متحدہ اور مسئلہ فلسطین
۱۳۔ یہودی ریاست کے سایہ میں

بلاشبہ اس موضوع پر پہلی ایسی مستند اور محققانہ کتاب

جس کیلئے

صدہا قادیانی غیر قادیانی اور یہودی ماخذ کو کھنگالا گیا ہے۔

آج ہی طلب فرمائیں ——— تبلیغ کے لئے سو نسخے طلب کرنے والوں کو ۳۳ فی صد رعایت۔

قیمت: ۱۵/- روپے، صفحات: ۲۲۴، کاغذ: عمدہ، طباعت: ونڈایک / آفسٹ، ٹائٹل جلد مع ڈسٹ کور

مؤتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

——— پاکستان ———